© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

گزشتہ ہفتے مجھے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ایک ایسی جگہ سے گزرنے کا اتفاق ہوا جو چند سال پیشتر بالکل ویرانہ تھا مگر اب وہاں جدید ڈیزائن کی بیشمار سر بفلک عمارتیں کھڑی ہیں۔ شہر کے اس خوبصورت حصّہ کو دیکھ کر کوئی انسان ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ قطعۂ ارضی پاکستان جیسے پس ماندہ ملک کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے جس کے بسنے والوں کی اوسط آمدنی دس آنے یومیہ ہے۔ پاکستان کے اس غلیشن ایبل حصّہ کی دولت و ثروت پر تبصرہ کرتے ہوئے میرے ایک رفیق نے کہا "ملک نے چند سالوں کے اندر حیرت انگیز ترقی کی ہے" اس پر دوسرے صاحب نے جو تاریخ اور اسلامی علوم کے ایک بہت بڑے عالم ہیں فوراً فرمایا "حضور یہ ترقی نہیں بلکہ تنزل کی علامت ہے۔ یہ عمارات ملک میں غیر عادلانہ تقسیم دولت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے ایک انسان فوراً اس امر کو جان سکتا ہے کہ یہ قوم عیش و تنعّم کی پرستار ہے اور اس کا مرکزِ و محور دنیاوی فوائد و لذائذ کا حصول ہے، اس کے دل میں نفس پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ فلک بوس محلات قومی ترقی کی شہادت نہیں دیتے بلکہ قربِ قیامت کی دہائی دے رہے ہیں۔"

ہماری زندگی کے اس شعبہ کے متعلق یہ دو متضاد اور متناقض آرا درحقیقت اس وسیع ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہے جس میں اس وقت پوری قوم گرفتار ہے اور یہی چیز وہ اصل بیماری ہے جو ہماری قوم کی فکری اور عملی قوتوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر سے کھا رہی ہے۔ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ ہم نے آج تک پورے اخلاص اور یکسوئی سے اس امر کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیصلہ نہیں کیا کہ ہمیں کدھر جانا ہے اور ہم کس سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ قوم کے دردمند کبھی تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر قوم کو کوستے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قوم کی ساری تعمیری صلاحیتیں ختم ہوگئی ہیں اور کبھی غیر ملکی سامراجی طاقتوں کو ہدفِ طعن بناتے ہیں لیکن عقل یہ ماننے پر تیار نہیں ہوتی کہ وہ قوم جو گزشتہ بارہ سو برس سے مختلف قسم کی گمراہیوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتی چلی آرہی ہو اور جسے اس معاملہ میں نہ تو غیروں کی قہرمانیاں اور دغا بازیاں اصل مقصد سے باز رکھنے میں کامیاب ہوئی ہوں اور نہ اپنوں کی چالاکیاں اور عیاریاں جادۂ مستقیم سے ہٹا سکی ہوں، وہ قوم گزشتہ چودہ سال کے قلیل عرصے میں بے شعور اور بے حس جانوروں کا ایک گلہ بن کر رہ جاتے جسے ذاتی اغراض بالکل میکانکی طور پر جس طرف چاہیں ہانک کر لے جائیں۔

ہمارے نزدیک قوم کے اندر اس ذہنی خلفشار کی اصل وجہ وہ شدید احساسِ ناکامی ہے جو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا ہے۔ ہماری حالت قرآن مجید کی اس تمثیلی بڑھیا کی سی ہے جو بڑی محنت اور مشقت کے بعد سوت کاتتی ہے مگر پھر اُسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر دیتی ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب غیر ملکی سامراج نے ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو ہمارے اندر یہ شعور بیدار ہوا کہ ہماری یہ سیاہ بختی ہماری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جس وقت سے اسلام سے منہ موڑا ہے اسی لمحہ سے ہم مختلف قسم کے مصائب کا شکار ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ہماری بربادی ذلت اور خواری کی اصل وجہ خدا سے بے تعلقی اور اس کے احکام سے روگردانی ہے۔ یہ ہماری دین سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ جس خطۂ ارضی پر ہم سات سو سال تک حکمراں رہے وہاں ہم محکوم و مغلوب بن کر رہ گئے ہیں۔ اس احساس نے مسلم قوم کو ایک نیا شعور اور ولولہ بخشا اور اس نے اسلامی آرزوؤں اور تمناؤں کے دیئے جلا کر اُس کی روشنی میں ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس جدوجہد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا سب سے پہلا نتیجہ بالاکوٹ کے میدان میں رونما ہوا جہاں حضرت شاہ اسماعیل شہید اور اُن کے جلیل القدر رفقاءِ کار کو شہادت نصیب ہوئی (اللہ تعالیٰ ان حضرات کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے)، اس کے بعد اسی احساس نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کر دیا پھر یہی احساس تحریکِ خلافت میں پوری طرح کارفرما رہا اور بالآخر اسی احساس کے تحت مسلم عوام نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اس کے حصول کے لیے ایسی زبردست قربانیاں دیں جن کی نظیر قومی جدوجہد میں بہت کم ملتی ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں کہ پاکستان کو صرف ایک مدبر کے ناخنِ تدبیر نے جنم دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تدبیر کے ساتھ اگر ہندوستانی مسلمان اپنی جان و مال اور عزت و آبرو تک لٹانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو پاکستان کا خواب ساری تدبیروں اور ہنرمندیوں کے باوجود خواب ہی رہتا شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ یہ صرف اسلامی نظام کا نعرہ ہی تھا جس کی کشش نے امتِ مسلمہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قیمتی سے قیمتی متاع اس جدوجہد میں جھونک دے۔ کیا مسلمانوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ انتقالِ آبادی میں اُن کو کس قسم کی مصیبتیں پیش آئیں گی اور سکھ اور ہندو اُن کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کریں گے کیا اُن چار کروڑ مسلمانوں کو جو ہندو اکثریت کے علاقہ میں آباد تھے اپنا حشر معلوم نہ تھا؟ کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ اُن کی مساجد اور اُن کے مقدس مقامات کے ساتھ متعصب اور تنگ نظر اکثریت کس قسم کا شرمناک رویہ اختیار کرے گی۔ محلات میں رہنے والوں اور صرف ایوانوں میں بحث مباحثہ کرنے والوں کی آنکھوں سے یہ حقائق اوجھل ہوں تو ہوں لیکن معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر مسلمان ان خوفناک نتائج سے پوری طرح آگاہ تھا۔ لیکن یہ جانتے ہوتے بھی اُس نے پاکستان کی صرف اس لیے حمایت کی کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں دنیا میں رہوں یا نہ رہوں مگر اس خطۂ پاک میں اُس کی دینی تمناؤں اور روحانی آرزوؤں کی تکمیل بالضرور ہو گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مملکت کے قیام تک تو وہ ہر خطرہ کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا رہا، ہر آفت کو جرأت و مردانی سے برداشت کرتا رہا مگر جب ملک فی الواقع معرض وجود میں آگیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل ہونے کی بجائے اُن کا یہاں خون کیا جا رہا ہے توقعات کے جو خواب اور امیدوں کے جو خاکے اُس نے اپنے قلب و دماغ میں بنا رکھے تھے، اور جن کی اثر آفرینی کے تحت اُس نے آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرنا تک گوارا کیا، وہ آہستہ آہستہ اُسے مٹتے ہوئے نظر آئے — اُس کی حالت اس بدنصیب انسان کی سی ہے جسے پیاس نے سخت پریشان کر رکھا ہو، اور وہ لق ودق صحرا میں دُور سے پانی کا چشمہ ابلتا ہوا دیکھے مگر جب انتہائی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد وہ اس چشمہ تک جا پہنچے تو اُسے معلوم ہو کہ یہ تو محض ریت کے چمکتے ہوئے ذرے ہیں جو پانی کی شکل میں اُس کے سامنے جھلملا رہے ہیں۔

آپ آج کسی محب الوطن مسلمان کے دل کو ٹٹول کر دیکھیے تو آپ اسی قسم کا احساس شکست اُس کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا پائیں گے۔ یہ احساس قوموں کی زندگی میں موت اور بربادی کا پیغام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے اندر ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئی ہیں اور اُس کے سامنے سوائے کام و دہن کی لذّت کے اب کوئی اونچا مقصد باقی نہیں رہا۔ پھر اس احساس کے پرورش پانے کے ساتھ ہی اس کے اندر وہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے جو اُس کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمرکاب ہو کر چلنے کا سبق دیتا ہے۔ اس جذبہ کے مفقود ہوتے ہی ایثار، ہمدردی، جرأت و شجاعت، حق گوئی و بے باکی جیسی بلند صفات بھی مٹنے لگتی ہیں اور وہ قوم قوم نہیں رہتی بلکہ انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ بن جاتی ہے جس کا ہر فرد خود غرضی، بے یقینی، عدم اعتماد اور نفس پرستی جیسی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ معاشرے کے اندر بھائی بھائی سے اُلجھتا ہے، حاکم محکوم سے دست و گریباں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے، امراء غربا پر دستِ ظلم دراز کرتے ہیں اور غربا امراء کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ الغرض ذہنی اعتبار سے اس شکست خوردہ سوسائٹی کا کوئی فرد ایسا نہیں ہوتا جیسے روحانی اور جسمانی طور پر کوئی سکون حاصل ہو۔ انسانی قلب و دماغ کے ہر گوشہ میں اور معاشرے کے ہر طبقے میں ایک ایسا اختلال پیدا ہو جاتا ہے جو دنیا میں اُسے کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

اسے اہلِ پاکستان کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس احساسِ شکست جیسے خوفناک رجحان کا نہ صرف یہاں آغاز ہوا بلکہ اُسے بڑھانے اور ترقی دینے کے لیے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلسل انتظامات ہوتے رہے ہیں۔ اگر اہلِ ملک کو پہلے دن ہی واشگاف الفاظ میں بتا دیا جاتا کہ پاکستان کو جو احیائے اسلام کا ذریعہ بتایا گیا تھا یہ محض ایک سیاسی نعرہ تھا جس سے وقتی طور پر فائدہ اٹھانا مقصود تھا سو وہ حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ملک کی تعمیر انہیں خطوط پر کرنی ہے جن خطوط پر مغربی قوموں نے کی ہے۔ اسلامی نظام محض قصۂ پارینہ ہے اور آج کے روشن دور میں یہ کبھی رہنما قوت نہیں بن سکتی" تو اس صاف گوئی سے اُن بے چاروں کے سامنے اصل عزائم کھل کر آجاتے اور وہ ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیتے — ان کے اندر بے یقینی اور عدمِ اعتماد کی وہ وبا نہ پھیلتی جو اس وقت اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جو گروہ بھی برسرِ اقتدار آتا ہے وہ پہلے اسلامی نظام کی برکات بیان کرتا ہے پھر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس ملک میں سوائے اس نظام کے کوئی دوسرا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا لہٰذا اسی نظام کو ہی اس خطہ میں بالادستی حاصل ہونی ہے۔ جب لوگ اس قسم کی خوش کن باتیں سنتے ہیں تو ان کے شکستہ عزائم میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے پست حوصلے پھر بلند شروع ہوتے ہیں مگر جب وہ حقائق کی دنیا میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کو برپا کرنے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے کچھ بھی نہیں کیا جارہا اور قومی تعمیر اور ترقی کے وہی منصوبے بنائے جارہے ہیں جو مغربی اقوام کے پیش نظر ہیں۔ اسلامی نظام کے متعلق یہ زبانی دعوے اور عملی اعتبار سے انحراف لوگوں کے اندر بار بار شکست کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اب اس احساس نے قنوطیت اور ملکی مسائل میں عدم دلچسپی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اہلِ ملک کے دلوں سے ملک کے سود و زیاں کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے اور اُن کے کان اب ہر دعویٰ کو محض ایک کھوکھلے نعرے کی حیثیت سے سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

لوگ جب ملک کی کسی صاحبِ اقتدار ہستی کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ یہاں اسلام ہی برپا ہوگا تو وہ بجا طور پر اس چیز کی توقع رکھتے ہیں کہ اس ملک کا نظامِ حیات جن بنیادوں پر قائم ہے اُن میں آہستہ آہستہ تبدیلی کی جائے گی۔ غیر مسئول اقتدار کی جگہ خدا کی حاکمیت قائم ہوگی۔ امیر اور غریب، گورے اور کالے کے درمیان جو مصنوعی دیواریں حائل ہیں وہ منہدم ہونگی۔ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم کی بجائے ہر فرد اور طبقہ کو اس کا جائز حق ملے گا اور کوئی شخص بھی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ ہوگا۔ معاشرتی زندگی نہایت پاکیزہ اصولوں پر مرتب ہوگی اور خانگی اور عائلی زندگی ہر قسم کی کشاکش اور غم و غصہ سے پاک ہوگی۔ پڑوسی اپنے پڑوس سے بالکل بے خوف ہوگا۔ حسین سے حسین اور نوجوان سے نوجوان خاتون معاشرے میں اس طرح مامون زندگی بسر کرے گی کہ غیر مرد کا طائرِ وسوسہ بھی اس کے حریمِ عصمت کی طرف پرواز نہ کرسکے گا۔ ملک میں راستبازی، حق گوئی، نیکی اور پرہیزگاری کا عام چلن ہوگا اور برائی اپنی ہر شکل میں یہاں سے مٹا دی جائے گی۔ اسلامی نظامِ حیات کا نام سُن کر یہ وہ عام توقعات ہیں جو بالکل فطری طور پر ہر مسلمان کے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک طرف تو زبانی دعووں سے مستقبل کے متعلق یہ بلند توقعات وابستہ کی جاتی ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری طرف انہیں توقعات کو زندگی کے ہر میدان میں عملاً جھٹلایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب امتِ مسلمہ یہ سنتی ہے کہ اس ملک کی معاشی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالی جائے گی تو وہ یہ سوچنے میں ہر لحاظ سے حق بجانب ہوتی ہے کہ اب ملک میں ایک ایسا معاشی نظام پروان چڑھیگا جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کی لعنتوں سے یکسر پاک ہوگا۔ اس بنا پر پہلا احساس جو ہر فرد کے ذہن میں بالکل فطری طور پر اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بالکل مصنوعی طریق سے دولت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے وہ کم ہو گی اور زر و مال کو یہاں فی الواقع وہی مقام دیا جائے گا جس کا اُسے اسلام مستحق قرار دیتا ہے دَورِ جدید میں بقولِ جوڈؔ انسانی روح صرف دولت و ثروت کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے، کیونکہ آج کا رب اکبر صرف ڈالر ہے۔ اس بنا پر معاشی میدان میں ہر شخص کا کعبۂ مقصود ایک ہی ہے کہ وہ حلال و حرام، جائز و ناجائز کی قیود سے یکسر آزاد ہو کر زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر کرے اور پھر اس سے زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد حاصل کرے۔ یہی اندازِ فکر اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے اندر کارفرما ہے۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس اسلام زر و مال کی محبت کو آزمائش سے تعبیر کرتا ہے اور انسان کو یہ بنیادی حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ بلاشبہ تمہاری خدمت و چاکری کے لیے ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیے مگر تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ پھر قرآن مجید دورِ حاضر کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرتا ہے کہ دولت قاضی الحاجات ہے کہ اس سے انسان کی ساری حاجتیں پوری ہو جائیں اور یہ کوئی ایسی پائیدار چیز ہے کہ اس پر ہمیشہ کے لیے تکیہ لگایا جا سکے۔ نقطۂ نظر کی اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ ایک انسان بالکل صحیح طور پر اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ جس معاشرے نے زر پرستی کی بجائے خدا پرستی کو اپنا اساسی اصول قرار دیا ہے اس میں دولت کمانے کے لیے وہ غیر صحتمندانہ منافقت اور رقابت نہیں ہوگی جو اس وقت ہمارے ہاں موجود ہے۔ پھر یہ نیا نظریہ ملت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نئی اقدار حیات عطا کرے گا جن میں شرافت اور عزت کا معیار بنک بیلنس، کوٹھیوں اور کاروں کی بجائے تقویٰ اور پرہیزگاری قرار پائے گا اور اسی کے مطابق ہر فرد کا سوسائٹی میں مرتبہ اور مقام متشخص ہوگا۔ دولت چند افراد یا ایک مخصوص طبقہ میں سکڑنے کی بجائے پوری سوسائٹی میں انصاف کے ساتھ تقسیم ہوگی اور اس طرح ہر قسم کے استحصال اور ناجائز نفع اندوزی کے راستے مسدود ہوں گے۔ اسلامی نظام معیشت کے یہ وہ قدرتی نتائج ہیں جو لازمی طور پر کچھ عرصہ کے بعد رونما ہونے چاہییں۔ لیکن اگر ایک گروہ دعوے تو اسلامی نظامِ معیشت کا کرے لیکن سوسائٹی کا سارا ڈھانچہ سرمایہ دارانہ اصولوں کے مطابق چلتا رہے۔ ملک میں دولت کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہے، جائز و ناجائز کی ان پابندیوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتے جو اسلام نے دولت کمانے اور صرف کرنے پر عائد کر رکھی ہیں، سود جو ارتکازِ دولت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے وہ ملک کے پورے معاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت سے شامل رہے۔ امیر اور غریب کے درمیان زبردست تفاوت پایا جاتے۔ ملک کی بیشتر دولت پر ایک مختصر سا طبقہ دادِ عیش دیتا رہے اور عظیم اکثریت نانِ شبینہ تک سے محتاج ہو۔ ایک طرف سر بفلک عمارات تعمیر ہو رہی ہوں اور دوسری طرف لوگوں کو سر چھپانے تک کے لیے جگہ نہ ملے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر کون شخص یہ باور کر سکے گا کہ اس ملک میں اسلامی نظامِ معیشت کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔ اگر وہ دین کا تھوڑا سا علم بھی رکھتا ہے تو وہ یہ سمجھے گا کہ اُسے محض اسلام کے نام پر دھوکا دیا جا رہا ہے اور اگر وہ علم دین سے بے بہرہ ہے تو وہ اس دین ہی کو تیاگ دے گا جو انسانوں کے درمیان اس قسم کی غیر عادلانہ تقسیم کو روا رکھتا ہے۔ یہ دونوں احساسات ملکی ترقی کے لیے کوئی فالِ نیک نہیں کہے جا سکتے۔

اسی طرح یہی ذہنی خلفشار ملک کے دستور و آئین اور اس کی سیاسی ہیئت کے متعلق ہر قدم پر پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک کا دستور و آئین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی ہوگا۔ یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس سے قوم کی مردہ تمناؤں میں بار بار زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ اور وہ پھر ایک بہتر اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا شروع کرتی ہے۔ وہ احساسِ زیاں جو گزشتہ چند سال کی وعدہ خلافیوں نے اُس کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ اُس کے اثرات بھی آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتے ہیں لیکن ابھی وہ اس انداز پر سوچنا ہی شروع کرتی ہے کہ اُس کے کان میں عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی ہیں۔ کبھی وہ سنتی ہے کہ اسلام کے غیر متبدل اصول دستور کی اساس ہونگے کبھی اسے کہا جاتا ہے کہ اسلامی روح دستور میں کارفرما ہوگی کبھی اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کی اٹل اور ابدی تعلیمات دستور کی بنیاد قرار پائیں گی کبھی اُس کے سامنے اس امر کا انکشاف کیا جاتا ہے کہ دستور رجعت پسندانہ نہیں ہوگا بلکہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔ یہ بھانت بھانت کی بولیاں سن کر قوم کے قلب و دماغ میں پھر شکستگی کے آثار ابھر آتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں بالکل بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وعدوں میں قرآن مجید کی غیر متبدل تعلیمات کا تو ذکر ہے لیکن سنت جو قرآن مجید کے بعد اسلامی دستور کی سب سے محکم بنیاد ہے، اسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور خاص طور پر جب حکمران طبقہ کے کچھ لوگ کھلے بندوں سنت کے خلاف اظہارِ خیال شروع کر دیں تو لوگوں کے دلوں میں دستور کی اسلامی حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا بالکل ایک فطری امر ہے۔ پھر ان شکوک کو برسرِ اقتدار طبقہ کے بعض انتہائی ذمہ دار افراد کے مختلف بیانات بھی مسلسل غذا فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جب یہ سنتے ہیں کہ مذہب انسان کی خدمت و چاکری کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ انسان مذہب کے بندھنوں میں گرفتار رہنے کے لیے تو وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ملک کی تعمیرِ جدید میں دین کی حیثیت رہنما قوت کی نہ ہوگی بلکہ تابع مہمل کی سی ہوگی جس کا کام حکمرانوں کی تمناؤں اور خواہشات کی بلا چون و چرا پیروی کرنا ہوگا۔ پھر اسلام کے غیر متبدل اصول اور اسلامی روح کا بھی جس انداز سے ذکر کیا جاتا ہے اُسے بھی کسی ہوشمند انسان کے قلب و دماغ کو یکسوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا بلکہ مزید اضطراب اور تردّد پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تو سارے احکام غیر متبدل اور ابدی ہی ہیں پھر یہاں ان کے اندر کس بنا پر تفریق کی جا رہی ہے۔ کیا اس تخصیص کا مقصد کہیں یہ تو نہیں کہ جو اصول مغربی افکار و تصورات کے مطابق نظر آئیں انہیں تو قبول کر لیا جاتے اور باقی اصولوں کو "تغیر پذیر فروعات" کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر ہمارے پیش نظر اسلام کو ہی ملکی دستور کی اساس اور بنیاد بنانا مقصود ہے تو پھر اس امر کا کیوں نہیں صاف صاف اعتراف کر لیا جاتا کہ ملک کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ اتنی سیدھی اور واضح بات کو اتنے ایچ پیچ کے ساتھ بیان کرنے کی مصلحت ایک عام مسلمان کے ذہن میں کبھی نہیں آسکتی۔

سیاسی میدان سے ہٹ کر ہم جب معاشرتی دائرہ میں نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں فکر و عمل کا یہی تضاد ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اس اندوہناک حقیقت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ اسلامی نظام کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ہم اقدارِ حیات طے نہیں کر پاتے۔ ملک کے اندر شراب خوری، حرام خوری، زنا، فحاشی، رشوت کا بازار گرم ہے لیکن ہم ان برائیوں کو مٹانے کے لیے اتنے مضطرب نہیں جتنے کہ ہمیں فی الواقع ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم ان برائیوں کو اُن نگاہوں سے ابھی تک دیکھنے کے عادی نہیں ہوئے جن سے اسلام انہیں دیکھتا ہے۔ ہمارے ذہنی پس منظر میں یہ برائیاں اُسی حد تک ناپسندیدہ ہیں جس حد تک کہ اہلِ مغرب انہیں قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ جب امتناعِ شراب کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر غور و فکر کرتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسے عملی جامہ پہنانے سے ہمیں کس قدر مالی خسارہ ہوگا یا ہماری اس روش سے کتنے غیر ملکی لوگ ہم سے ناراض ہوں گے۔ ایک ایسی برائی جسے اسلام انتہائی نفرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور جس کا وجود اسلامی معاشرہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا اُس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر ہم مادی منفعت وابستہ کرلیں اور اس مسئلہ پر مادی سود و زیاں یا چند غیر ملکی افراد کی ناراضگی کے نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کر دیں تو یقیناً اس کے بارے میں ہمارے احساسات میں وہ شدت باقی نہ رہے گی جس کا اسلام ہم سے متقاضی ہے۔ ہم اسے ایک قابلِ برداشت ناپسندیدہ فعل سمجھتے ہوئے اس سے اغماض برتتے چلے جائیں گے اور جلد ہی مجبوریوں کے نام پر اس ناپاک کاروبار کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے خود مواقع فراہم کریں گے۔ قریب قریب یہی حال زنا کا ہے کسی اسلامی مملکت کے لیے اس سے زیادہ شرمناک کوئی بات نہیں کہ اس کے بسنے والے اس خوفناک برائی کا ارتکاب کریں۔ اسلام کے نزدیک یہ قتلِ انسان سے زیادہ سنگین جرم ہے جس کی شریعت اسلامی میں انتہائی عبرتناک سزا مقرر کی گئی ہے۔ لیکن دیکھیے کہ اسلام کے ساتھ محبت اور عقیدت کے اظہار کے باوجود ہم اس برائی کے بارے میں کس نوعیت کے احساسات رکھتے ہیں۔ وہ برائی جس کی سزا اسلام نے سنگسار کرنا مقرر کی ہے اسے اگر چند اوباش اور آوارہ لوگ حکومت سے لائسنس حاصل کر کے فروغ دیں تو اس کا کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اور اگر یہ جرم لائسنس کے بغیر کیا جائے تو پھر وہ کسی قدر قابلِ گرفت ہے۔ آپ آج کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں تو آپ کو کالم کے کالم اس گھناؤنے جرم سے بھرے ہوئے ملیں گے کیا انہیں دیکھ کر ہماری غیرت کو وہی تازیانہ لگتا ہے جو فی الواقع لگنا چاہیے۔ ہمارے اس بدنصیب معاشرہ میں روزانہ کتنی بے بس عورتیں غنڈے اور بدمعاش لوگوں کے ہاتھوں اغوا کی جاتی ہیں اور پھر اُن پر جو بیتتی ہے اُس کے تصور سے بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے تدارک کے لیے بیشک حکومت کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔ کہیں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ ہے، کہیں چھاپے مارے جا رہے ہیں، کہیں ایسے مجرموں کو عدالتوں کے کٹہروں میں کھڑا کیا جا رہا ہے لیکن اس معاملہ میں بھی دیکھنے کی چیز وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، یعنی اس جرم کی سنگینی کو ہم اُس شدت سے محسوس کر کے اس کے مطابق عمل نہیں کر رہے جس کا کہ اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ درحقیقت ہمارے احساسات بدل گئے ہیں۔ ہم اسے اسی طرح کی چھوٹی موٹی برائی سمجھتے ہیں جس طرح کہ دوسری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برائیاں ہیں۔ اگر سرحدوں کی حفاظت حکومت کا فرض ہے تو اس سے کہیں زیادہ اہم فرض لوگوں کی عفت اور عصمت کی پاسبانی کا بھی ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس فرض کے معاملے میں اتنی ہی حساس ہونی چاہیے جتنی کہ وہ ملک کے قیام اور بقا کے معاملے میں ہوتی ہے اور جو افراد ملک کے اندر عفت کے قلعوں کو مسمار کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں وہ ان باغیوں سے کسی طرح کم نہیں جو ناپاک عزائم کے ساتھ ملک کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان کے اس معاملے میں جذبات کتنے نازک ہوتے ہیں اُس کا اندازہ حجاج بن یوسف جیسے ظالم حکمران کے طرزِ عمل سے لگایا جاسکتا ہے۔ حجاج کے عہد میں حکومت اُن فرائض کو کما حقہٗ ادا نہ کر رہی تھی جو اسلام نے اُس پر عائد کیے ہیں۔ خود حجاج بھی کوئی خلفائے راشدین کی طرح کا کوئی خلیفۂ راشد نہ تھا، ایک آمر اور مستبد فرمانروا تھا لیکن اُسے جب اس بات کا علم ہُوا کہ اُس کی قوم کی چند بیٹیاں ظالموں کے نرغے میں ہیں تو اُس نے فوراً ایک لشکرِ جرّار اُن کی بازیابی کے لیے روانہ کر دیا اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک کہ انہیں آزاد کرا کر مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔

پھر آپ اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ اگر ہم زنا، شراب، فحاشی اور بدکاری کا فی الواقع پاکستان میں استیصال کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو کیا مثبت طور پر بھی ہم اس سلسلہ میں اتنا کام کر رہے ہیں جس کا یہ کام مستحق ہے۔ یہ ساری برائیاں کسی معاشرے میں یونہی نہیں پھیل جاتیں۔ ان کی پشت پر زبردست محرکات کارفرما ہوتے ہیں جو انسان کے قلب و دماغ کو اس طرف لگاتے ہیں۔ نکاح پر نارواقسم کی پابندیاں، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول، بے حجابی، رقص و سرود کی مجالس کا انعقاد، آرٹ اور شعر کے نام پر سفلی جذبات کی تسکین۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے "معصوم" فتنے ہیں جن سے ان بڑی برائیوں کو قوت و طاقت فراہم ہوتی ہے۔ اگر ان بڑی برائیوں کو مٹانا مقصود ہے تو پھر ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے فتنوں کو ابھارنے کی بجائے انہیں مٹانے کی فکر کریں۔ لیکن اس وقت ملک میں صورتِ حال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ درپیش ہے کہ ہم ان چھوٹے فتنوں کو "ترقی" کے نام پر پالنا بھی چاہتے ہیں اور ان کے نتیجے میں جو برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں انہیں ختم کر دینے کے بھی متمنی ہیں۔ دنیا میں اس سے زیادہ سادہ اور بیوقوف کونسا شخص ہوگا جو اپنے مکان کو نذرِ آتش بھی کرے اور پھر اس بات کا بھی خواہشمند ہو کہ اُس کی عمارت اور اُس کے اندر جو مال و متاع موجود ہے وہ سب محفوظ رہے۔

ہمارے اندازِ فکر کی بنیادی خامی وہی ہے جس کا ہم نے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ ہم آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ہماری منزلِ مقصود کیا ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد کے بارے میں یکسو ہو جاتے تو ہمیں فکری اور عملی اعتبار سے وہ دقتیں پیش نہ آتیں جو اس وقت پیش آ رہی ہیں۔ مقصد کے تعین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسانوں کی خفتہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ مقصد ہی انسانوں کو زندگی اور اس کے معاملات کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے طے ہو جانے کے بعد پھر اُس شخص کی ساری فکری و عملی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر مقصد ہی کسی معاشرہ کے اندر اقدارِ حیات کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک انسان یا سوسائٹی اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے افکار و تصورات، یا افعال و اعمال یا مختلف حالات و واقعات پر جو نیک و بد، محمود و مذموم کا حکم لگاتی ہے تو اس کے لیے فتویٰ مقصد کی بارگاہ ہی سے جاری ہوتا ہے۔ یہ اقدار کسی سوسائٹی کے بقا، استحکام اور ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ نہ صرف انسان کے فکری سانچوں کو ایک خاص طرز پر ڈھالتی ہیں بلکہ اس کے احساسات و جذبات کی بھی ایک نہج پر پرورش کرتی ہیں۔ اس سے انسان اور معاشرہ کے اندر فکری اور عملی خلفشار ختم ہوتا ہے اور اس کی قوتیں ایک خاص راہ پر صرف ہونا شروع ہوتی ہیں۔ کسی قوم کا مستقبل متعین کرنے میں، اس کی ترقی اور فلاح و کامرانی کے منصوبے بنانے میں اس کی تطہیر میں یہ اقدار اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ قوم جس نے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اندر اقدارِ حیات کی پورے طور پر نشوونما نہیں کی اُس کی حیثیت اُس بے لنگر جہاز کی سی ہے جسے فکر و نظر کے تھپیڑے جس طرف چاہتے ہیں بہا کر لے جاتے ہیں۔ وہ فاصلے تو بہت طے کرتا ہے لیکن منزلِ مقصود کو حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

ہمارے سامنے آج سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ہم خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنی منزل کا تعیّن کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مطالبہ کے وقت سے لیکر آج تک ہم مسلسل یہی دہراتے چلے آئے کہ ہمیں اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہے، یہاں صرف اسلامی نظام کو نافذ کرنا ہے لیکن اس افسوسناک حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا عمل ہمارے ان دعووں کی تائید نہیں کرتا۔ اگر اسلام فی الواقع ہماری منزلِ مقصود ہوتا تو آج ہماری جدوجہد کا رُخ کچھ اور ہوتا۔ معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے آج کتنے منصوبے بن رہے ہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے قوم سے کس قدر محنت اور کتنے سرمایہ کا تقاضا کیا جا رہا ہے لیکن کیا ان معاشی منصوبوں کی نسبت سے آدھی یا چوتھائی رقم یا محنت بھی اخلاقی منصوبوں کی تکمیل کے لیے صرف کی گئی ہے؟ اس معاملے میں آخر ہم کیوں اتنے بے حس ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہماری نظر میں معاشی استحکام اخلاقی استحکام کی نسبت بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حالانکہ کسی اسلامی معاشرہ میں اگر ان دو کے درمیان کبھی ترجیح کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو اولیت کا شرف ہمیشہ اخلاق کو ہی حاصل ہوگا۔ ہم کسی ایسے معاشی استحکام کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اخلاقی حدود و قیود کو نظر انداز کر کے حاصل کیا گیا ہو۔ اسلام دنیا کی ایک اخلاقی اور روحانی قوت ہے اور اس لیے ایک مسلمان جب تک کہ وہ مسلمان ہے ہر چیز کی قدر و قیمت اخلاقی اور روحانی معیار کے مطابق طے کرتا ہے۔ اس بنا پر خوشحالی اور بدحالی، ترقی اور تنزل کے ہمارے اپنے الگ پیمانے ہیں اور جن کے مطابق ہی ہم اپنے منصوبوں اور پروگراموں کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ضبطِ تولید یورپی اقوام کی نظر میں معیارِ زندگی بلند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کا ایک مجرب اور آسان نسخہ ہے لیکن ہمیں اس نسخہ کو آزمانے سے پہلے اس کے معاشی فوائد سے زیادہ اس کے اخلاقی مفاسد کا بھی جائزہ لینا ہے کیونکہ اگر یہ بالفرض ایک طرف ہمارا معیارِ زندگی بلند کرنے کا ذریعہ بھی ثابت ہو جاتے لیکن دوسری طرف۔ جو ہمارے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ یہ ایسی اخلاقی بیماریوں کو جنم دے گا جو ہماری نظر میں اُس غربت اور افلاس سے کہیں زیادہ خوفناک ہیں جن سے ہمیں اس وقت خوف زدہ کیا جا رہا ہے۔ ایک مسلمان کے ہاں ہر عمل کی اخلاقی حیثیت اس کی دوسری تمام حیثیتوں سے زیادہ وزنی ہے اور اس سے ہم کسی حالت میں بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جو اس ملک کے کسی بھی بہی خواہ کی نظر سے کبھی بھی اوجھل نہ ہونی چاہیے کیونکہ اس کے اوجھل ہونے سے ہی ہمارے اندر فکر و عمل کا انتشار پیدا ہو رہا ہے جس سے گزشتہ چودہ سالوں میں ہمیں کافی نقصان پہنچا ہے۔ ہم اس بات کو جتنی جلدی ذہن نشین کر لیں یہ اتنی ہی ہمارے حق میں مفید اور کارآمد ہوگی۔

© rasailojaraid.com